جناب ڈاکٹر رفیع الدین صاحب مرحوم

باب دوم

تخلیق و ارتقاء

ہم جانتے ہیں کہ کائنات کی بنیادی فطرت ایک مسلسل شعوری عمل ہے۔ اس لیے اسے شعور ہی کی تخلیق کہنا مناسب ہے۔ یہ دنیا مکمل شکل میں یکایک تو معرضِ وجود میں نہیں آگئی تھی بلکہ روز تخلیق سے مسلسل عملِ ارتقاء کے باعث موجودہ صورت تک پہنچی ہے۔ حقیقتاً تخلیق نے ارتقاء کا روپ دھار لیا ہے کیونکہ ساری مخلوق خواہ وہ انسانی ہو یا غیر انسانی، یہی صورت اختیار کرتی ہے۔

اگر ہم عملِ ارتقاء کی گذشتہ کڑیوں کا سراغ لگائیں تو ایک ایسے مقام پر پہنچتے ہیں جہاں صرف مادہ ہی کا وجود تھا اور عضوی زندگی معدوم تھی، بلکہ اس سے پہلے کا وہ مقام بھی سامنے آتا ہے جہاں لفظ کے عام مفہوم کے مطابق مادہ بھی موجود نہ تھا بلکہ صرف قوت و استعداد ہی موجود تھی۔ اور آخر کار ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں جہاں شعور کے سوا اور کچھ بھی نہ تھا۔ مادہ منفی اور مثبت سالمیات سے مرکّب ہے جنہیں آپ برقی قوت کی لہریں بھی کہہ سکتے ہیں، لہٰذا مادّہ کو قوت میں منتقل کیا جا سکتا ہے اور موجودہ علمِ طبیعیات کے مطابق قوت کا فنا بھی ممکن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ تخلیقی عمل شعوری طور پر شروع کیا گیا تھا اور شعوری طور پر ہی اس کا تسلسل بھی قائم رکھا گیا ہے۔ سر جیمز جینز اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ حقیقت کائنات صرف خالق کا خیال ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خالق کا یہ خیال اس کی تمنائے تخلیق کے بغیر ممکن نہیں۔ اور ارتقائی عمل کے دوران یہ اسی نوعیت کا ادراکِ خودی ہے جیسے ایک مصوّر کے قلم سے اُبھرتی ہوئی تصویر کے دوران اس کی تخلیقی انگیخت اپنا ادراک کرتی ہے۔ یہ انگیخت شعور کی ایک طاقتور لہر کی صورت میں نمودار ہوتی ہے۔ گویا تخلیقی عمل میں مصروف یہ لہر ایک رواں دواں ندی ہے جو اپنی پسندیدہ اور منتخب سمت میں بہتی چلی جا رہی ہے۔ اسی سے ارتقائی عمل جنم لیتا ہے

جو ارتقاء کی حیوانی سطح پر نمودار ہوتا ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسے برگساں قوتِ محرکہ حیات اور فرائڈ اسے انسانی سطح کی غیر شعوری حالت یا طلبِ حیات (Libido) کا نام دیتا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر شعور نے کائنات کی تخلیق کیوں کی۔ اس کے جواب میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شعور کے تخلیقی عمل اور اس کی سمت کا انتخاب لازماً اس کے فطری اور خودکارانہ داعیۂ خودنمائی پر مبنی ہونا چاہیے جس سے اس کے امتیازی خصائص کا اظہار ہو سکے۔ یہ شعور کی فطرت کا داعیہ تھا کہ وہ تخلیق کرے اور وہ بھی ٹھیک اسی صورت اور طریق سے جس طرح اس نے واقعتہً کیا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ شعور کی فطرت اس کائنات کے علاوہ کسی دوسری کائنات کی تخلیق سے عاجز ہے۔ بلکہ نہایت آسانی سے یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اس نے ایسی ہی کچھ دیگر اقسام کی کائناتیں تخلیق کی تھیں اور آئندہ بھی تخلیق کرتی رہے گی۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ جو مصوّر ایک خوبصورت تصویر بنانے پر قادر ہے۔ اس میں کئی دوسری حسین وجمیل تصاویر بنانے کی بھی صلاحیتیں موجود ہیں۔ ہمہ اوست اور وحدت الوجود کے ماننے والوں کی طرح ہم تخلیقی شعور اور کائنات کو ایک نہیں سمجھتے۔ تصویر مصوّر سے الگ چیز ہوتی ہے۔ اسی طرح تقریر اور مقرر ایک نہیں ہو سکتے۔ کتاب کا وجود اپنے مصنّف سے علیحدہ ہوتا ہے۔ ہر مصوّر دوسری تصویریں بنا سکتا ہے۔ ہر مقرر دوسری تقریریں کر سکتا ہے۔ اور ہر مصنّف کتنی ہی دوسری کتابیں تصنیف کرنے پر قدرت رکھتا ہے۔ اسی طرح خالق اس کائنات سے بالکل الگ اور جداگانہ وجود رکھتا ہے جو اس کی تخلیق اور اس کی قوت کا مظہر ہوتی ہے۔

سائنس کا ایک مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے حواس کی مدد سے علم حاصل کریں اور موجودہ کائنات کے متعلق سائنس اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ یہ شعور کے تخلیقی عمل کے باعث معرضِ وجود میں آئی جو دراصل قوت کی ایک ایسی نوری شکل تھی جسے کائناتی شعاعوں کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے پرتو سے فضا معمور ہو گئی۔ یہ اصول کہ روشنی اور نور سے زیادہ تیز رفتار اور کوئی شے نہیں اس حقیقت کی طرف واضح اشارہ ہے کہ ہر مادّی چیز قوت ہی سے ارتقاء پذیر ہوتی ہے۔ اس قوت نے منفی اور مثبت لہروں کی شکل اختیار کی جسے الیکٹرون اور پروٹون کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مناسب وقت پر اکٹھی ہوئیں اور مختلف اقسام کے سالمات کی تخلیق ہو گئی۔ ان میں سے سادہ ترین سالمہ ہائیڈروجن کا ہے جو ایک مثبت اور ایک منفی برقیے سے مرکب ہے۔ دوسری اقسام کے سالمات دوسری نوعیت کے ترکیبی مجموعوں کا مظہر ہیں۔ آغاز میں اس دنیا کی شکل دھوئیں کی سی تھی جو ایک بہت بڑے گھومتے پھرتے بادل یا دھندلی فضا کی صورت اختیار کر گئی۔

گردش کے دوران میں دھندلکے کی یہ وسیع و بسیط فضا چھوٹے چھوٹے سحابیوں میں بٹ گئی اور پھر ہر سحابیہ نے سیّاروں کے نظام یعنی اجرامِ فلکی کی شکل اختیار کر لی۔ ہمارا یہ سُورج جس کے گرد زمین گھوم رہی ہے اسی کوکبی نظام کا ایک حصّہ ہے جو اس وسیع سحابیے کی تقسیم سے معرضِ وجود میں آیا۔

پس قرنوں کی گردش میں تخلیقی عمل کے ذریعے مادہ بلند سے بلند تر صورت اختیار کرتا چلا گیا یہاں تک کہ آج کے سارے معلوم مادّی قوانین مکمل ہو گئے۔ اِس تکمیل میں جو زمانہ صرف ہؤا یعنی آغاز سے زمین کی پیدائش و ترتیب کا اندازہ $10^{12} \times 200$ سال لگایا گیا ہے۔

یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ اگرچہ مادّہ اور حیات بظاہر مختلف نظر آتے ہیں مگر ان دونوں کی حقیقت ایک ہے یعنی شعوُر۔ علاوہ ازیں مادّہ میں ایک تحریکِ عمل موجود ہے خواہ وہ غیر تبدیل ہی کیوں نہ ہو۔ اور عمل خاصّۂ حیات ہے۔ جرمنی فلاسفر لیبنیز کا خیال تھا کہ مادہ باشعُور ذرّوں کا مرکّب ہے جنہیں وہ ابتدائی جسیمہ کا نام دیتا تھا۔ مادّہ کے شعُور سے متصف ہونے کی ایک شہادت یہ بھی ہے جب سالمات کیمیاوی عمل میں سے گزرتے ہیں تو انہیں شعُور ہوتا ہے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ جیسے کسی مادّے کی قلمیں بنانے کے عمل کے دوران ہم دیکھتے ہیں کہ ریزے اکٹھے ہو کر خود بخود قلموں کی شکل اختیار کرتے چلے جاتے ہیں صاف دکھائی دیتا ہے کہ ان کا عمل شعوُری ہے۔ جس طرح ایک زندہ جسم میں شریانوں کی راہ خون دوڑتا رہتا ہے اسی طرح ہر "مادّہ" کے اندر ایک رَو کار فرما ہوتی ہے خواہ بظاہر وہ ہمیں مُردہ دکھائی دے رہی ہو۔ درحقیقت ہر شے زندہ ہے۔ کیونکہ اس میں وہ اجزاء موجود ہیں جن کے باعث خود بخود عمل ہوتا رہتا ہے۔ ایسی سب اشیاء انسانی اور حیوانی جسم کی طرح خارجی حرکات و حالات سے اثر پذیر ہوتی ہیں۔ بلاشبہ ان کا عمل کچھ قطعی اور مخصوص اصُولوں کا پابند ہے۔ جن کا کیمیادان اور ماہرینِ طبیعیات برابر مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ انسانی اور حیوانی اجسام میں بھی یہی اصول کارفرما ہوتے ہیں جو ماہرینِ طبیعیات کی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔ کرکٹ کا ایک کھلاڑی جب گیند کو ضرب لگاتا ہے تو گیند ایک خاص فاصلے تک اچھلتی جاتی ہے کھلاڑی نے ایک خاص ماحول میں ایک عمل کیا ہے یعنی ایک محرک پر ردِعمل پیش کیا ہے اور گیند نے بھی بالکل ایسا ہی کیا ہے۔ اگر گیند زندگی سے بالکل عاری ہوتی تو کرکٹ کا کھیل ناممکن ہو جاتا۔ خاص ماحول اور محرکات پر ردِعمل کا ظہور زندگی کا خاصہ ہے۔ اسی باعث مادّہ میں زندگی موجود ہے۔ وہ باشعُور ہے، باخبر ہے لہٰذا قابلِ فہم بھی ہے۔

اس طرح اگر نمو کو زندگی کا خاصہ مان لیا جائے تو اس سے بھی وہ عاری نہیں۔ کیونکہ مادہ اگر اپنی قوت کے ذریعے ترقی کرتے ہوئے خود بخود موجودہ صورت تک آپہنچا ہے۔ (آپ اسے بیج کہہ سکتے ہیں) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ مادہ کے ہر نوع کی موجودہ شکل اسی طرح اپنی بنیادی قوت میں مضمر تھی جس طرح ایک درخت اپنی ساری شاخوں، پتوں، پھولوں اور پھلوں سمیت اپنے بیج میں موجود ہوتا ہے۔ اور فرد کی نفسیاتی اور مادّی خصوصیتیں اس جوہر میں موجود ہوتی ہیں جس سے وہ جنم لے کر پروان چڑھتا ہے۔ مادّہ ہرگز مُردہ نہیں، زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حیوان کی زندگی مادہ کی زندگی سے بلند تر حالت میں ہے۔ جس طرح ایک انسان کی زندگی حیوان کی زندگی سے ارفع ہوتی ہے۔

مادّہ کی زندگی ایک اور زاویہ سے بھی ثابت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ مادّہ اور اس کے اصولوں کے بغیر حیاتیاتی زندگی ممکن نہیں۔ اور یہ مادّی اصول و قوانین ہی کی کارفرمائی ہے جس سے سُورج چمکتا ہے ہوا چلتی ہے۔ بادل بارش برساتے ہیں۔ دریا رواں ہیں، موسم بدلتے ہیں اور رات دن کی گردش کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ محسُوس ہوتا ہے کہ مادّی اصول و قوانین شعوری یا غیر شعُوری طور پر اس طرح بنائے گئے ہیں کہ اس زمین پر حیات کا ظہور و ارتقاء اسی شکل و صورت میں ہونا چاہیے تھا جس میں واقعتہً یہ ہوا۔ کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی عام قانون میں اِستثنا کی ضرورت تھی وہاں متعدد استثنائی صورتیں پیدا ہو گئیں۔ مثلاً ایک اصُول یہ ہے کہ مائع اجسام سردی سے سکڑتے ہیں لیکن جب پانی کو بہت زیادہ سرد کیا جائے تو یہ پھیل جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ برف پانی سے ہلکی ہو جاتی ہے اور سطح پر بہتی رہتی ہے۔ بظاہر یہ ایک معمولی سی بات ہے لیکن اگر ایسا نہ ہوتا تو اس کرہ ارض پر حیوانی زندگی کا وجود بالکل عنقا ہو جاتا۔ سمندر اور جھیلیں اُوپر سے نیچے تک منجمد ہو جاتیں۔ اس نوعیت کی ایک نہیں بلکہ بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ "مادّہ" ایک خاص طرز عمل کے ساتھ مل کر ایک ایسے ماحول کو جنم دیتا ہے جس میں حیات کی پیدائش، افزائش اور ارتقاء ممکن ہے۔

حیوانی یا نباتاتی زندگی کے لیے سازگار ماحول کا موجود ہونا ناگزیر ہے۔ پروفیسر ہیلڈان اور چند دیگر ماہرین حیاتیات کا خیال ہے کہ مجموعی طور پر حیوانی زندگی جسم اور ماحول سے عبارت ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ ہم کاب ہو کر، ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو ماحول بھی حیات کا ایک جزو لاینفک ہے۔ سب سے پہلے خلیے کو معرض وجود میں لانے سے پیشتر اس کی زندگی

کے لیے سازگار ماحول فراہم کیا جا چکا تھا۔ امیبا اگرچہ ماحول کے صرف ایک ہی حصہ سے براہِ راست اثر پذیر ہوا لیکن وہ کل سے علیحدہ نہ تھا۔ بلکہ اپنی کل یعنی کائنات ہی کا ایک حصہ تھا۔ لہٰذا امیبا کے پیدا ہوتے ہی پوری کائنات جس کے ساتھ اس کا سابقہ پیش آیا اس کا ماحول بنی اور اس طرح وہ اس کل کا ایک جزو قرار پایا۔ امیبا کی پیدائش کی علت بھی یہ تھی کہ مسلسل ارتقاء سے پوری کائنات میں مادہ نے نئی شکل اختیار کی اور اس میں بھی وہ سارے اوصاف پیدا ہو گئے جو اس میں موجود تھے اس طرح کائنات مسلسل ارتقاء سے اس مقام تک آ پہنچی جہاں سے اس نے اس ننھے منھے خلیہ کی تخلیق کی راہ ہموار کی عمل حیات یا عمل شعور جو اس عضویہ کی پیدائش کا باعث بنا وہ اس کے معرض وجود میں آنے سے پہلے بھی کائنات میں پوری طرح جاری و ساری تھا زندگی کی سرگرمی کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہ تھا کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اس ننھی سی جان کی تخلیق کرے ——— اس کی تخلیق کے ساتھ ہی ارتقائے حیات کا آغاز ہوا جو زندگی کی صرف ایک صورت کا آغاز تھا جسے ماضی میں ہم مادہ کے نام سے تعبیر کرتے تھے۔

اگرچہ ہمیں اس کا علم نہیں کہ کائنات میں کہیں اور بھی زندگی موجود ہے یا نہیں لیکن اگر ہو تو بنیادی طور پر وہ بھی یقیناً اس کرۂ ارض کی زندگی ہی کی طرح ہو گی، اگر فرق ہوا تو بالکل معمولی ہو گا اس کی وجہ یہی ہے کہ ارتقائے حیات کی ایک لازمی منزل یعنی مادہ پوری کائنات میں ایک ہی تو ہے۔

چونکہ حیوانی یا نباتاتی زندگی کا ماحول یعنی مادہ پہلے وجود میں آیا اور اس کے فطری نمو کی وجہ سے زندگی بعد میں ظاہر ہوئی اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ جسے ہم ماحول کا نام دیتے ہیں وہ دراصل ارتقاء کی ابتدائی منزلوں میں زندگی ہی تھی۔ حیوانی یا نباتاتی زندگی اگرچہ بعد میں ظہور پذیر ہوئی لیکن مادہ سے اس کا تعلق ایک شاخ اور تنے کا سا ہے۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ بنیادی طور پر درخت کے تنے سے پھوٹ نکلنے والی ایک ٹہنی اس سے الگ اپنا کوئی وجود نہیں رکھتی، وہ اس کا ایک حصہ ہوتی ہے ایک منزل پر زندگی کا ماحول درحقیقت پورے ماضی کا ہر لحاظ سے ترجمان ہوتا ہے۔ کسی سطح پر زندگی کے ماحول کا سب سے اہم حصہ ارتقاء کی وہ منزل ہوتی ہے جو اس سے پہلے گزر چکی ہو۔ کیونکہ اس کے حوالے سے موجودہ مقام کا تعین ہو سکتا ہے۔ حیات کا ماحول دراصل گذشتہ زندگی ہی کا نام ہے اور اس کا وجود و ظہور آئندہ زندگی کے لیے ناگزیر ہے۔ حیات اپنا ماحول خود بناتی ہے اور اس کا نمو عمل اور ردِ عمل کا رہینِ منت ہوتا ہے

ایک حیوانی زندگی کی طرح پُوری کائنات اپنے وجود کے اندر ہر لحظہ مصروفِ ارتقا ہے۔

مادہ چونکہ زندگی میں مزاحم ہوتا ہے۔ محض اس بنیاد پر اس کے الگ وجود کو ماننے کا کوئی جواز نہیں موجودہ حیات ہمیشہ آئندہ حیات کی مزاحمت کرتی رہتی ہے اور یہ مزاحمت اس کے مستقبل میں نمو و ارتقاء کے لیے ناگزیر ہے اپنے وجود کے ساتھ جد و جہدِ حیات کا عمل ارتقاء ہے۔ زندگی اپنے حال کی مزاحمت کو راستے سے ہٹا کر آگے بڑھتی ہے اس کا مستقبل حال ہی سے تعمیر پاتا ہے۔ ایک درخت کی طرح یہ برابر بڑھتی ہی چلی جاتی ہے کیونکہ اس راہ میں ہر قدم موجودہ قدم سے آگے بڑھتا ہے۔

مادہ اصلاً ابتدائی زندگی ہے اور جن اصولوں کا یہ پابند ہے، اُن کی حیثیت اُن ناقابلِ تغیّر میلانات کی سی ہے جن کی اس نے حیوانی جبلتوں کی طرح خود بخود پرورش کی۔ یہ میلانات مادہ کے مماثلات کو ظاہر کرتے ہیں جو شعور کے تخلیقی عمل کے باعث ارتقاء کے دوران پروان چڑھتی رہی ہے۔ مماثلات کی تلاش زندگی کا خاصہ ہے۔ یہ مادّہ میں بھی موجود ہے حیوان میں اور انسان میں بھی۔ قوانینِ طبیعی شعور کی وہ فتوحات ہیں جو خود ارتقائی کی جد و جہد میں حاصل ہوئی ہیں وہ اٹل ہیں۔ غیر تبدیل ہیں۔ انہیں اٹل کہنے کی وجہ یہ نہیں کہ تجربہ سے ہمیشہ ایسا ثابت ہوا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں تبدیلی کی ضرورت نہ رہی۔ یہ اصول و قوانین ماضی میں عرصہ دراز تک تبدیل اور متغیّر ہوتے رہے، ترقی پاتے رہے اور جب وہ اس صورت تک پہنچ گئے جو زندگی کے مزید ارتقاء کے لیے مناسب تھا تو وہ متعیّن اور خودکار ہو گئے جبکہ تغیّر زندگی کی ہر اعلیٰ سطح پر برابر جلوہ گر رہا۔ زندگی اپنے مقامات نمو میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اور جب کسی سمت میں اس کا نمو ختم ہو جاتا ہے تو یہ اس مقام پر آ کر ٹھہر جاتی ہے۔

برگساں نے اس ضمن میں بڑے پیارے دلائل دیئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ حیوانی زندگی کی مختلف سمتوں میں حیات کا ارتقاء شعور کے اندرونی دباؤ کا نتیجہ ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے قویٰ کا ادراک کرتا ہے۔ ایک جاندار جس حد تک باشعور ہوتا ہے اسی حد تک اس کی کوششیں اس دباؤ کو زیادہ سے زیادہ مصروفِ عمل کر دیتی ہیں۔ نتیجتہً شعور اپنے قدم آگے بڑھاتا ہے اور اس جاندار میں اپنا ترقی پذیر مقام متعیّن کر کے خود کو منوا لیتا ہے۔ جس زندگی نے ارتقائی منازل طے کیں اس نے موانع کے باوجود ایسا کر دکھایا۔ جہاں کہیں بھی کسی جاندار کو مزاحمت سے واسطہ پڑا وہیں اس کے سعی و عمل میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ اندرونی دباؤ بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ رکاوٹیں شعور کا راستہ نہ روک سکیں۔ بلکہ اس کے برعکس شعور نے ہمیشہ ہی

مزاحمتوں کی وجہ سے ارتقاء کی بلند ترین منازل طے کیں ــــــ کسی جاندار کے ارتقاء کی جو سمت بھی سامنے آتی ہے خواہ وہ اس کی اپنی سعی و جہد کا ثمرہ ہو یا شعور کے میلانات کا ــــ وہ بہر حال باطنی قوتوں ہی سے متعین ہوتی ہے ــــ جب کوئی جاندار شعور کے رجحانات کی سمت ترقی نہ کر سکے یعنی وہ صحیح سمت میں آگے نہ بڑھ سکے تو اس کا ارتقاء رک جاتا ہے اور چونکہ حیات کو اس کی ضرورت نہیں رہتی اس لیے وہ آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتا ہے ــــــ بہت سی انواع اس کرۂ ارضی پر معرض وجود میں آنے کے بعد معدوم ہوئیں۔ شعور اپنے ارتقائی منازل وہیں تک طے کر سکا جہاں تک اس کے قویٰ نے اس کا ساتھ دیا جس منزل پر وہ خود نمائی سے قاصر رہا، سمجھ لیجیے کہ شعور میں اس سے آگے بڑھنے کی صلاحیت ناپید ہو چکی ہے اور جب بھی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے شعور ایک جاندار عضویہ کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ وہ آگے بڑھنا شروع کر دیتا ہے جب تک وہ عضویہ ارتقائی عمل سے گزرتا رہتا ہے ۔ وہ پھلتا پھولتا ہے، پروان چڑھتا ہے، بڑھتا ہے ۔ ترقی کی منازل طے کرتا اور شعور کی خفیہ قوتوں کو اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ یہ وہی قوتِ محرکہ حیات یعنی شعور کی لہر ہے جس نے اس حیوانی مقام میں ارتقائے حیات کو ممکن بنایا اسی سے مادہ نے ارتقاء پایا تھا کہ مسلسل تبدیلیوں میں سے گزرتے ہوئے آگے بڑھتے بڑھتے وہ مقام آگیا کہ ایک چھوٹے سے امیبا کی پیدائش ممکن ہو گئی۔

اس امیبا کی نمو حیات کی تاریخ میں ایک لمحاتی واقعہ تھا۔ کیونکہ اس کے بعد حیات ایک بالکل نئی سمت میں چل نکلی جس سے اس کے ارتقاء کے مقامِ ثانی کی تعیین ہوئی۔ اس مقام پر حیات نے مادہ کی مزاحمت اور اس کے قوانین کو پہلی مرتبہ توڑا۔ بلاشبہ یہ وہ قوانین تھے جن کی بدولت وہ اپنے موجودہ مقام تک پہنچا تھا اور جو اس کے آئندہ نمو اور ارتقاء کا راستہ نہیں روک سکے تھے۔ یہ عضویہ "حرکت" پر قادر تھا۔ اور ایک "مردہ" مادے میں یہ طاقت نہ تھی۔ طبعی قوانین اس کی راہ میں مزاحم تھے شعور کی قوت نے اس مزاحمت کو توڑ دیا۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ننھا سا عضویہ ــــ امیبا ــــ معرضِ وجود میں آگیا۔ جس میں زندگی نے اپنے آپ کو مرتکز کر لیا۔ یہ عضویہ حرکت کر سکتا تھا اور قوانین طبعی کو توڑ سکتا تھا۔ اس لحاظ سے جب یہ پہلے پہل معرضِ وجود میں آیا تو تخلیق کا ایک عجوبہ تھا۔ زندگی اپنی زیادہ سے زیادہ تکمیل کے لیے اِس جاندار کو بطور رہ گزر کے استعمال کرنے والی تھی۔ چنانچہ امیبا نے سلوک و رویّہ کے رجحانات جنہیں ہم جبلّتیں کہتے ہیں، فروغ دے لیا جس کی بدولت یہ نہ صرف اپنی زندگی کی حفاظت بلکہ

بقائے نسل کا اہتمام بھی کر سکا۔ یہ صرف اسی طریقے سے امکانی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے سے زندگی کی کوششوں کو جاری رکھ سکتا تھا۔ ابھی زندگی کو بہت سی راہ طے کرنی تھی۔ اور اگرچہ اس نے مادہ کی مزاحمت کو توڑ دیا تھا لیکن ابھی پوری طرح نہیں توڑا تھا۔ ابھی وہ صرف ایک نقطہ پر کامیاب ہوئی تھی حیوانی مرحلہ پر زندگی کی بعد کی کامیابیاں ظاہر کرتی ہیں کہ جب یہ یک عضوی مرحلہ پر پہنچی تھی تو ابھی مادے کی بہت سی پابندیاں اسے دامن گیر تھیں جن سے وہ بتدریج ہی آزاد ہو سکتی تھی۔ غذا اور تولید کی دو بنیادی جبلتوں کے اظہار اور استعمال کی کوشش نے اس ننھے جاندار کو اس قابل بنا دیا کہ وہ شعور کے زور یا محرک کی بدولت مرورِ زمانہ سے اپنی قوتوں میں اضافہ کرتا چلا جائے۔ اس طرح رفتہ رفتہ زندگی کی زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ صورتیں معرضِ وجود میں آگئیں جو اپنی جبلتوں کو زیادہ عمدگی اور اہلیت سے تسکین بخش سکتی تھیں۔ اس لیے ان بنیادی جبلتوں اور شعور کی فطرت کے اندر بے شمار دوسرے رجحانات میں امتیاز کرنا ممکن ہو گیا۔

یہ ایک یاد رکھنے والا اہم نکتہ ہے کہ زندگی کا وہی رجحان جبلت کی صورت اختیار کر سکتا تھا جو پہلے ہی شعور کی فطرت میں داخل تھا۔ اور زندگی اس کی نمود کر سکتی تھی۔ ارتقائے انواعِ حیوان کے محض تنازع للبقا کی وجہ سے نہیں ہوتا جیسا کہ ڈارون اور لامارک نے فرض کر لیا ہے۔ اگر یہ ایسا ہوتا تو ارتقا کسی طرف اور ہر طرف لامتناہی ہو جاتا لیکن ایسی بے شمار انواع گنی جا سکتی ہیں جن کا ارتقا مدتوں سے ختم ہو چکا ہے۔ ان کے متعلق معلوم ہو چکا ہے کہ وہ عرصہ بعید سے اسی طرح شکل بدلے بغیر ہم تک پہنچی ہیں۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ جو حیوان زندہ رہنے کے قابل ہو وہ ہمیشہ ارتقا کے بھی قابل ہو۔ ہم اس بات کی قطعاً امید نہیں کر سکتے کہ گھوڑے کی نسل ارتقا کر کے کبھی انسان یا فوق الانسان کی نسل بن سکے گی۔ ایسی انواع کا ارتقا ختم ہو چکا ہے۔ اور اس کا سبب یقیناً یہ ہے کہ اب ان کی زندہ رہنے کی کوششیں شعور کی امنگوں کو پورا نہیں کر سکتیں۔ بنیادی طور پر انواع کا ارتقا شعور کے زور، جذبے یا داعیے کا مرہونِ منت ہے جو اپنی امکانی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانا چاہتا ہے۔ جاندار کی کوششیں اس زور یا داعیے کو زیادہ سے زیادہ عمل میں لاتی ہیں۔ اور جب وہ اس زور یا داعیے کی حمایت نہیں کر سکتیں تو پھر کوئی ارتقا نہیں ہوتا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر اس نوع کو اسی حالت پر قائم رہنے یا آہستہ آہستہ مٹ جانے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔

جب گراموفون ریکارڈ بج رہا ہو تو آواز سوئی کی حرکت سے آواز گیر یعنی ساؤنڈ بکس میں پردہ یا دیافرام کے ارتعاش سے پیدا ہوتی ہے لیکن سوئی ریکارڈ کی لکیر کی لہروں میں اوپر نیچے ہوتی رہتی ہے۔ جہاں کسی آواز کا گایا ہوا گیت مضمر شکل میں موجود ہوتا ہے۔ فرض کیجیے کہ مریخ کا ایک سائنس دان بصارت کی اتنی محدود قوتیں رکھتا ہے کہ وہ آواز گیر اور سوئی کو تو دیکھ سکتا ہے لیکن وہ اس ریکارڈ اور اس کے لکیروں اور لہروں کو دیکھنے کے ناقابل ہے جس پر کہ سوئی گھومتی ہے۔ وہ اس حقیقت کو ہرگز معلوم نہیں کر سکے گا۔ کہ سوئی اسی حالت میں ترنم پیدا کر سکتی ہے جب اس کی حرکات ایک خاص ترتیب کے ماتحت ہوں اور اگر حرکات اس ترتیب سے ہٹ جائیں تو وہ ترنم فوراً بند ہو جائے گا۔ وہ اس بات کو تو وثوق سے کہہ سکے گا کہ یہ ترنم سوئی کی حرکات کا نتیجہ ہیں لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا کیوں ہے۔ اس کا بیان درست ہوگا لیکن نامکمل اور ادھورا ہوگا۔ اسی طرح اس سائنسدان کا بیان بھی اتنا ہی نامکمل مگر درست ہوگا جو ارتقائے انواع کے متعلق یہ کہے کہ محض جاندار کی کوششوں سے اس کی جسمانی ساخت میں متزائد تغیر پیدا ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ ایک نئی نوع کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ وہ اس بات کی توجیہ نہیں کر سکتا کہ جاندار کی کوششیں بعض حالتوں میں تو تبدیلیاں پیدا کر دیتی ہیں لیکن بعض حالتوں میں نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سوئی کی حرکات اسی حالت میں ترنم پیدا کرتی ہیں جب وہ گراموفون ریکارڈ کی ایک خاص تدبیر کے مطابق ہوتی ہیں۔ اسی طرح جاندار کی کوششیں اس کی جسمانی ساخت میں اسی وقت تبدیلیاں پیدا کرتی ہیں جب وہ شعور کی پوشیدہ فطری صلاحیتوں کے مطابق ہوتی ہیں۔ جس طرح ترنم کی علتِ اولیٰ اس ریکارڈ کی غیر مرئی قوتوں میں مضمر ہے۔ جو اپنی نمود کے لیے اس سوئی کو اوپر نیچے کرتی ہیں اسی طرح ارتقا کی علتِ اولیٰ شعور کی ان پوشیدہ صلاحیتوں میں مضمر ہے جو اپنی تکمیل کے لیے اس طریق کار کو آگے بڑھا رہی ہیں۔ زندگی ارتقا پذیر انواع کی جبلتوں کے صرف انہی رجحانات کا اظہار کر رہی ہے جو اس کی فطرت میں پہلے سے موجود ہیں۔

جوں جوں جبلتیں فروغ پاتی گئیں شعور کو مادے میں اپنی نمود کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا گیا۔ اگرچہ جبلتیں بڑھتی گئیں اور اس طرح سے زندگی کو اپنی نمود کا زیادہ سے زیادہ موقع ملتا گیا کیونکہ اس طرح زندگی زیادہ اعلیٰ اور منظم شکلوں میں ترقی کرتی گئی، لیکن یہ سب اس عضویہ کی بقائے ذات اور بقائے نسل کی دو بنیادی جبلتوں کی خدمت میں ظہور پذیر ہوئیں جتنی زیادہ جبلتیں بڑھتی گئیں جاندار

کو بقائے ذات اور بقائے نسل کے لیے اتنے ہی زیادہ پیچیدہ ذرائع حاصل ہوتے گئے۔ جبلّتوں کی ترقی میں جتنا جاندار کی زندہ رہنے کی کوشش اور ضرورت کا ہاتھ ہے۔ وہاں نمود کے لیے شعور کی کوشش اور ضرورت کا بھی اتنا ہی دخل ہے۔ لہٰذا جبلّتیں شعور کی فطری صفات اور رجحانات کے اظہار کا نام ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ زندگی نے اپنے آپ کو پیچیدہ اور منظم بنا لیا۔ اور نئی جبلّتیں پیدا کرنے سے نئی قوتیں حاصل کر لیں۔ لیکن ہر نئی ترقی یافتہ جبلّت محض ایک متعیّن اور بے لچک رجحان تھی جسے جاندار نے جب اُسے کسی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا جو ایسی جبلّت کے لیے کافی محرک بن سکتی تھی ضرورتاً قبول کر لیا۔

جبلّتوں سے متعلق تمام رجحانات شروع سے ہی شعور کے اندر خوابیدہ تھے لیکن ان میں سے بعض نے کسی اور سمت کی نسبت ایک خاص سمت میں زیادہ واضح اور زیادہ قوت سے ترقی کی کیونکہ اُس جاندار کو مخصوص حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ اور اُسے مخصوص کوششیں کرنی پڑیں۔ اِس سبب نے زندگی میں ایک عظیم تنوع پیدا کر دیا۔ اگرچہ زندگی کی قوتیں بڑھ گئیں لیکن وہ انہیں حسبِ خواہش استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ بالفاظ دیگر زندگی اپنی جبلّتوں کی مخالفت کرنے کے ناقابل تھی۔ چنانچہ اس طرح زندگی پر جبلّتوں کی پابندیاں عائد تھیں۔ یہ پابندیاں قوانین طبعی کی پابندیوں کی طرح تھیں۔ گو جبلّتیں قوانین طبعی کی نسبت بہت زیادہ آزادی بخشتی تھیں۔ چونکہ ابھی زندگی نے مادّے سے مکمل آزادی حاصل نہیں کی تھی۔ اس لیے اِس کی پابندیوں سے آزاد ہونے کے لیے اِسے بہت جدوجہد کرنی پڑی۔ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور بروئے کار لانے کے لیے اس نے دائیں بائیں ہر طرف رُخ کیا۔ اور ارتقا کی مختلف سمتوں میں چل نکلی۔ اِس جدوجہد کی وجہ سے بے شمار نئی انواع ظہور میں آنے لگیں۔ بعض دفعہ تو یک لخت اور بعض دفعہ تدریج۔ اگرچہ اسے ہر قدم پر مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن بحیثیتِ مجموعی یہ اس پر غلبہ پانے میں کامیاب ہو گئی۔ اور اس طرح یکے بعد دیگرے کامیابی حاصل کرتے ہوئے یہ خودنمائی کی شاہراہ پر بڑھتی گئی۔ یہ صحیح ہے کہ کہیں کہیں ایک آدھ نوع کو ایسی مزاحمت کا بھی سامنا کرنا پڑا جس کی وہ تاب نہ لا سکی، اور بالآخر رُوئے زمین سے نیست و نابود ہو گئی۔ لیکن ہمیشہ ایک سمت میں ناکامی کی تلافی دوسری سمت کی کامیابیوں سے ہوتی رہی۔ زندگی نے کسی ایک سمت کی کامیابی کو بھی ضائع نہیں ہونے دیا۔ بلکہ اسے شاہراہ ارتقا کی کسی نہ کسی دوسری سمت میں محفوظ کر لیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کبھی

کسی حقیقی ناکامی سے دوچار نہیں ہوتی ۔ یہ ہمیشہ ارتقا کرتی رہی ہے ۔ آہستہ آہستہ سوچ سوچ کر لیکن قدم بقدم اور متواتر ۔

زندگی کی منزلِ مقصود بہت دور تھی ۔ تاہم یہ ہر لحظہ قریب سے قریب تر ہو رہی تھی ۔ اس منزل کے قریب پہنچنے سے کہیں پہلے اس کی ترقی ارتقا کی ایک سمت کے سوا جو انسان کی طرف لے جا رہی تھی، ہر سمت میں رُک گئی ۔ ان تمام سمتوں میں اس نے اپنے فطری رجحانات کو فروغ دیا ۔ لیکن یہ ترقی بعض دوسری سمتوں کی نسبت ایک سمت میں زیادہ تھی ۔ اگرچہ اس طریق کار سے اس نے بعض کامیابیوں کو ہاتھ سے کھو دیا ۔ لیکن چونکہ اس کی ترقی کم از کم ایک سمت میں پوری طرح ہو رہی تھی اس لیے اسی ایک سمت میں ارتقا کرتے ہوئے اس کا تمام کامیابیوں سے ہمکنار ہونا یقینی تھا ۔ ہم اتنا سمجھ سکتے ہیں کہ جب انسان نقطۂ کمال پہ پہنچ جائے گا تو اس میں اُن تمام رجحانات کے اصول ہم آہنگی سے ظہور پذیر ہوں گے جنہیں زندگی نے دوسری انواع میں تو فروغ دے لیا ہے لیکن ابھی انسان میں فروغ نہیں دیا ۔

زندگی کو انسانی قالب میں ڈھلنے کے لیے لاکھوں سال کشمکش کرنی پڑی ہے ۔ اولین عضویہ کے ظہور اور انسان کے ظہور کے درمیانی عرصہ کا اندازہ ۵۰۰ × ۱۰^۶ یعنی ۵۰۰۰۰۰۰۰۰۰ (پانچ ارب) سال لگایا جاتا ہے ۔

عملِ ارتقا کا یہ خاصہ معلوم ہوتا ہے کہ نمایاں نفع حاصل کرنے کے لیے بے شک بہت کچھ ضائع کر لیا ہے ۔ بعض اوقات ہم اس کی غلط تعبیر کرتے ہیں اور اسے فطرت کا ظلم یا بے مقصدیت سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں ع "کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے" کا اصول کارفرما ہے جب تک نقصان نہ ہو نفع نہیں ہو سکتا ۔ اور چونکہ نفع بہت زیادہ قابلِ قدر ہے اس لیے نقصان کی کہیں زیادہ تلافی ہو جاتی ہے تخلیق اُن بے شمار امکانی صلاحیتوں میں سے جنہیں زندگی اپنی نمود کے لیے اختیار کر سکتی ہے صرف اسی صلاحیت کو منتخب کرتی ہے جو اس کی مستقبل کی خواہشات کی تکمیل کے لیے سب سے زیادہ قوی اور محکم ہو سکتی ہے ۔ اور فطرت ان امکانی صلاحیتوں کا امتحان تخلیق کے عملی تجربے سے لیتی ہے ۔ زندگی بے شمار صورتوں میں اپنی نمود کرتی ہے ۔ اور پھر اُس ایک کو سب پر ترجیح دیتی ہے جو اس کے مقاصد کے لیے سب سے زیادہ ہونہار معلوم ہوتی ہے ۔ اور باقی تمام صورتوں کو فنا ہونے یا بغیر ارتقا کے زندہ رہنے کے لیے چھوڑ دیتی ہے ۔ یہ کسی معین لائحہ عمل کی پیروی نہیں کرتی ۔ کیونکہ اس صورت میں یہ تخلیق نہ ہو گی ۔ بلکہ تقلید او نقالی ہو گی ۔ جوں جوں یہ آگے بڑھتی ہے اس کا لائحہ عمل مرتب

ہوتا جاتا ہے تخلیق ایک آزاد عمل ہے ۔ یہ بعینہٖ ایسا ہے جیسا ہمارے اپنے معاملات میں ہوتا ہے ۔ کوئی طریقِ عمل اختیار کرنے سے پہلے ہم مختلف امکانات کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر ایک کے سوا سب کو مسترد کر دیتے ہیں ۔ ہم عمل کرنے کے بغیر سوچ سکتے اور مسترد کر سکتے ہیں ۔ لیکن شعور کے لیے سوچنا ہی عمل اور تخلیق کرنا ہے ۔ ہم پابند ہیں لیکن زندگی پر کوئی پابندی نہیں ۔ اپنی امکانی صلاحیتوں میں سے کسی ایک کی تخلیق کرنے اور اس میں اپنی نمود کرنے کے لیے زندگی کو پوری آزادی ہے ۔ یہ ان میں سے اس ایک کو جو سب سے زیادہ ہونہار ہوتی ہے منتخب کرتی اور محفوظ رکھتی ہے ۔ اسے اپنی تخلیق کا وہ حصہ جس میں مستقبل کے لیے اٹھان یا بار آوری کی قوت نہیں ہوتی رد کرنا پڑتا ہے اور اس حصے کو جس سے یہ اپنی ترقی کو قائم رکھ سکے تقویت دینا اور باقی رکھنا پڑتا ہے ۔ تاہم جہاں تک شعور کا تعلق ہے آزادیٔ عمل اسے رونما ہونے والے واقعات کے علم سے محروم نہیں کرتی ۔ شعور وقت سے بالا ہے اور اس کے لیے حال اور فردا برابر ہیں ۔ یہ امر کہ شعور کے پاس تخلیق کا کوئی معین لائحہ عمل نہیں ہوتا ، اور اس کے باوجود اسے آئندہ واقعات کی تفصیل کا علم ہوتا ہے بظاہر ایک منطقی تضاد نظر آتا ہے ۔ دراصل اس حقیقت کا ادراک عقل نہیں کر سکتی ، اسے صرف نفس ہی براہِ راست اور وجدان کے ذریعے سے خود شعور ہی کے ایک بلند مقام پر سمجھ سکتا ہے ۔ اس مقام کے متعلق ہم اس کتاب میں آگے چل کر ذکر کریں گے ۔

کیا زندگی انسان تک پہنچ کر ارتقا کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گئی ہے یا انسانی مرحلہ بھی حیوانی مرحلے کا تسلسل ہی ہے ؟ دوسرے الفاظ میں کیا انسان اور حیوان کے درمیان کیفیت کا فرق ہے یا کمیت کا ۔ قسم کا فرق ہے یا درجے کا ۔ یہ ایک بنیادی فرق ہے جسے ہم بطورِ مثال مادے اور حیوان میں دیکھتے ہیں ہمارا ایمان ہے کہ انسان حیوان سے بہت اعلیٰ ہے ۔ جب زندگی حیوانی مرحلے میں داخل ہوئی تو اس کی خاص کامیابی یہ تھی کہ اس نے جبلتوں کے داعیے کو پیدا کیا جس کی بدولت یہ مادے کے داعیے یعنی قوانینِ طبیعی کی مخالفت کر سکی ۔ یہی کامیابی ہے جو حیوان کو مادے سے اس قدر ممتاز کر دیتی ہے ۔ وہ کیا خاص چیز ہے جسے زندگی نے انسانی مرحلے پر پہنچ کر حاصل کیا ہے ؟ اگر ہم اس کا کھوج لگائیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ پیچیدہ اور منظم کرنے اور لاکھوں سال کے دوران میں بے شمار مشکلات اور مصائب کے باوجود حیوانی مرحلے میں سے ہو کر آگے ہی آگے بڑھنے سے زندگی کا کیا مقصد ہو سکتا ہے ؟ اس مقصد میں یقیناً خود تخلیق

کا مقصد بھی شامل ہے اِس سے ہمیں اِس بات کا سُراغ مل سکتا ہے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اور آئندہ منزلِ مقصود کیا ہے؟

برگساں نے اِس بات پر صحیح اصرار کیا ہے کہ حیوان اور انسان کے درمیان درجے کا فرق نہیں بلکہ نوع کا فرق ہے۔ آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ حیوان ایک ادنیٰ قسم کا انسان ہے، یا انسان ایک اعلیٰ قسم کا حیوان ہے۔ شعُور جو انسان سے ادنیٰ تر زندگی کی صورتوں میں مقیّد و محبُوس ہے۔ انسانی شکل میں آکر یک لخت آزاد ہو جاتا ہے۔ بندر کے دماغ اور انسان کے دماغ کی ترکیب اور ضخامت میں بہت کم فرق ہے۔ لیکن اِس بہت کم فرق کا نتیجہ بہت بڑا ہے۔

برگساں لکھتا ہے:

"وہ حرکی ترکیبات جنہیں ذہن کسی حیوان میں پیدا کر دیتا ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں وہ عادات جنہیں رضاکارانہ اختیار کر لیا جاتا ہے۔ سوائے اِس چیز کے کوئی مقصد و مدّعا نہیں رکھتیں کہ وہ اُن ترکیبات میں جمع شدہ عادات کے مطابق حرکات میں کامیابی حاصل کریں۔ لیکن انسان میں حرکی عادت ایک دوسرا نتیجہ پیدا کر سکتی ہے جو پہلے سے قطعاً غیر متناسب ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام حرکی عادات ایک حرکی عادت کے ماتحت ہو جائیں۔ اور اِس طرح خود کاریت پر غلبہ پا کر شعور کو آزاد کر دیا جائے۔"

برگساں کے قول ہی کے مطابق آپ ایک ایسی کل کا تصوّر کریں۔ جس کا دستہ گھمانے کے لیے ایک کل کار کی مسلسل توجہ کی ضرورت ہے۔ اگر کسی دن کل کار اِس بات کا پتہ چلا لے کہ دستے کو ایک رسی سے مشین کے پہیے کے ساتھ باندھ دینے سے دستہ خود بخود گھوم سکتا ہے تو کتنا فرق پڑ جاتا ہے۔ دونوں حالتوں میں مشین کی ترکیب قطعاً وہی رہتی ہے۔ لیکن پہلی صورت میں اسے کل کار کی مسلسل توجہ کی ضرورت تھی لیکن دوسری صورت میں اب کل کار کے لیے یہ ممکن ہو گیا ہے کہ وہ اپنی توجہ کسی اور طرف کر سکے۔

اِس امر کا مطلب کہ شعوُر مادّے کی پابندیوں سے آزاد ہو گیا ہے۔ اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اب یہ اپنی طرف توجہ کرنے اور اپنے آپ کو جاننے کے لیے آزاد ہو گیا ہے۔ اِس نے آزادی اور خود شعوری دونوں چیزیں حاصل کر لی ہیں شعوُر کے لیے علم آزادی ہے اور آزادی علم۔ آزادی اور علم ایک ہی شئے کے دو مختلف نام ہیں۔ حیوان صرف باشعور ہے یعنی وہ جاننے، محسوس کرنے اور سوچنے کے قابل ہے لیکن آدمی

خود شعور ہے۔ وہ صرف جانتا، محسوس کرتا اور سوچتا ہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ جانتا، محسوس کرتا، اور سوچتا ہے اس سے ایک عظیم فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی برتری کی بنا پر جو انسان کو حیوان پر حاصل ہے۔ انسان اپنی جبلی خواہشات پر قابو پا سکتا ہے لیکن حیوان ایسا نہیں کر سکتا۔

چنانچہ ہم اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔ کہ عمل ارتقا سے شعور کا مقصد یہ تھا کہ اُسے خود شعوری یعنی آزادی اور خود بینی حاصل ہو جائے۔ انسان میں پہنچ کر زندگی اپنی تازہ حاصل کردہ قوت خود شعوری سے اس قابل ہو گئی کہ وہ قوانینِ طبیعی کی مزاحمت پر قابو پا سکے۔

کیا زندگی کی پیش قدمی جاری رہے گی۔ یا یہ انسان کی منزلِ مقصود پر پہنچ کر ٹھہر گئی ہے؟

جب تک یہ دنیا موجود ہے ارتقا کا عمل جاری رہنا چاہیے۔ قوتِ محرکہ حیات نے ماضی میں بہت سی منزلیں طے کی ہیں۔ اپنی زندگی کے ہر روز، ہر ساعت، ہر لحظہ یہ ایک نئی سے نئی منزل مقصود پر پہنچتی رہی ہے۔ ہر منزل نے اسے ایک اور منزل کا پتہ دیا جس کے حصول میں یہ پھر رواں دواں ہو گئی۔ یہ کہیں نہیں رکی۔ کیونکہ یہ رک ہی نہیں سکتی تھی۔ زندگی کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے۔ موجودہ منزل بھی اس کے سامنے بے شمار منزلوں تک پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔

زندگی اپنے آپ کو ہمیشہ بے نقاب اور وا شگاف کرنے پر مجبور رہے۔ یہ کبھی نہیں رک سکتی۔ شعور کا راز یہ ہے کہ اس میں ہمیشہ انقلاب آتا رہے۔ خود یہ حقیقت کہ ہم زندہ ہیں۔ اور دنیا ہمارے اردگرد شدت و تندی سے بدل رہی ہے اس بات کی علامت ہے کہ شعور کی نمود ابھی اپنے کمال کو نہیں پہنچی۔ اور یہ کہ ابھی اسے اپنی پوشیدہ شان و شوکت کا بہت کچھ اظہار کرنا ہے۔

جونہی یہ کائنات پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گی یہ یقیناً فنا و برباد ہو جائے گی۔ اور اس کی جگہ ایک نئی دنیا جنم لے گی تخلیق شعور کا ازلی خاصہ ہے۔ اور ایک کائنات کو ختم کرنے کے بعد خالق ایک دوسری کائنات کی تخلیق شروع کر دے گا جس طرح کوئی مصور ایک تصویر ختم کرنے کے بعد دوسری تصویر شروع کر دیتا ہے تخلیق ادوار کی صورتوں میں جاری رہتی ہے لیکن اس کا آغاز ہے نہ انجام۔

شعور کا مقصد اپنے لیے آزادی اور خود بینی حاصل کرنا ہے۔ اور اسے ابھی تک وہ زیادہ سے زیادہ آزادی اور خود بینی حاصل نہیں ہو سکی جسے یہ حاصل کر سکتا ہے۔ اسے ابھی اپنے متعلق بہت کچھ جاننا ہے جب پہلا (ایمبا) معرضِ وجود میں آیا تو وہ تخلیق کا ایک عجوبہ تھا۔ دوسری تمام اشیاء کے برعکس یہ قوانین طبیعی

کی مزاحمت کے باوجود خود بخود حرکت کر سکتا تھا خواہ یہ حرکت کتنی ہی خفیف تھی۔ یہ اپنے آپ کو غذا دے سکتا تھا خود بڑھ سکتا تھا اور اپنی نسل بڑھا سکتا تھا لیکن اس کی حیرت انگیز قوتوں کے باوجود یہ اُن قوتوں کا صرف ایک شمہ ہی ظاہر کر سکتا تھا جو شعور میں خوابیدہ تھیں۔ اور نہ جنہیں شعور نے بعد میں حیوانی مرحلے پر بھی عمل ارتقا کے دوران میں بندروں اور بن مانسوں میں ظاہر کیا۔ اسی طرح اگرچہ حیوان کے مقابلے میں انسان تخلیق کا ایک عجوبہ ہے لیکن یہ آنے والی مخلوق کے مقابلے میں محض ایک حیوان ہے۔ شعور نے ابھی انسان میں اپنے صرف ایک جزو کی نمود کی ہے۔ زندگی میں بہت سی صلاحیتیں ہیں جو بروئے کار آنے کی منتظر ہیں۔

یہ کہنا کہ انسان ایک خود شعور حیوان ہے یہ معنی رکھتا ہے کہ اُس کے دماغ کی ساخت اتنی ترقی یافتہ ہے کہ مادہ اُس کی خودشعوری کی ترقی کو نہ روکتا ہے نہ روک سکتا ہے لیکن خود شعوری کو ابھی لا انتہا حد تک پھیلنا اور بڑھنا ہے۔

اگر زندگی کی پیش قدمی لا انتہا ہے تو پھر اس کا مستقبل کیا ہے؟

زندگی کے ارتقا کے متعلق حسب ذیل تین حقائق واضح ہیں۔

اوّلاً یہ کہ شعور اب انسان اور صرف انسان کے ذریعے مزید ترقی کرے گا۔ ارتقا کی باقی تمام سمتوں میں اس کی ترقی رک چکی ہے۔ اِس وقت زندگی کی انتہائی ترقی یافتہ شکل انسان ہے۔ لہٰذا صرف انسان ہی وہ شارعِ عام ہے جس پر سے گزرتے ہوئے زندگی اپنی لا انتہا ترقی جاری رکھ سکتی ہے۔

ثانیاً شعور کا آئندہ ارتقا بیش از بیش آزادی اور خود بینی حاصل کرنے میں ہوگا۔ مستقبل میں بھی کامیابی اُسی قسم کی ہونی چاہیے جس قسم کی ماضی میں ہوتی ہے۔ جذبہ زندگی کو یکساں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا مستقبل ماضی کی طرح ہی ہو۔ یعنی اسے اپنی گذشتہ کامیابیاں محفوظ رکھنی چاہییں اور اس میں آئندہ اضافہ کرتے جانا چاہیے۔ اب تک اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ خود بینی ہے اور جو کچھ یہ آئندہ حاصل کرے گا خود بینی میں مزید اضافے کی نوعیت کا ہی ہونا چاہیے۔

ثالثاً، زندگی کے آئندہ ارتقا کے لیے اب نئی انواع کی ضرورت نہیں ہم جسے ارتقائے انواع کہتے ہیں وہ درحقیقت ارتقائے شعور ہے اور ارتقائی انواع اپنے دماغ یعنی آلۂ شعور کی روز افزوں پیچیدگی کے ساتھ ارتقا کی محض آلۂ کار بن کر خدمت کر رہی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ارتقائے شعور کا مطلب شعور کا خود اپنی ذات کے متعلق ارتقائے علم ہے۔ اب جب کہ شعور کا مادّی آلۂ کار یعنی مادّی جسم اور دماغ شعور

کی مزاحمت نہیں کرتا اور اسے خود بینی کی اجازت دے دیتا ہے تو شعور اپنی آزادی میں جتنا چاہے اضافہ کر سکتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مادے کی پابندیاں یعنی مادی جسم اور اس کے متعین رجحانات شعور کی ترقی میں مزاحم ہوں گے لیکن وہ اسے روک نہیں سکتے۔ شعور کو جب ایک دفعہ اپنے ایک جزء پر کچھ قدرت حاصل ہو گئی تو وہ اس میں مزید اضافے کرتا چلا جائے گا۔

جس طرح انسانی فرد کی زندگی میں دماغ بچپن سے ایک خاص حد تک ترقی کرتا ہے جس کے بعد دماغ نہیں بلکہ اُس فرد کا علم ترقی کرتا ہے اسی طرح زندگی کی تاریخ میں دماغ کی زیادہ سے زیادہ تنظیم لیے ہوئے نئی نئی انواع کا ظہور ایک خاص حد تک ہوتا ہے ــــ اور انسان زندگی کی یہی شکل ہے۔ اور اس سے پرے انواع یا دماغ سے ارتقا کی توقع نہیں کی جا سکتی بلکہ انسانی خود شعوری ترقی کرتی ہے۔ یہ امر کہ انسان خود شعور ہو گیا ہے اِس بات کی علامت ہے کہ شعور کا مادی آلۂ کار یعنی دماغ اپنے منتہائے کمال کو پہنچ گیا ہے۔ اس لیے اب انسان کا آئندہ ارتقا نئی نئی انواع کے ظہور میں آنے کی وجہ سے اس کے مادی جسم یا دماغ کی اور زیادہ ترقی اور پیچیدگی سے نہیں ہو گا بلکہ اس کی خود بینی کے کمال پر منحصر ہو گا